"سود" میں نئے مباحث کا اضافہ

(مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان)

(۱)

نظام سرمایہ داری کا تاریخی پس منظر

جیسا کہ گذشتہ نمبر میں بتایا جا چکا ہے، مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنی کتاب "سود" میں بطور ترمیم چند نئے مباحث قلمبند فرما کر ملتان جیل سے روانہ کیے ہیں۔ ان مباحث کو ایک علیحدہ ضمیمہ کے طور پر شائع کر دیا جائیگا۔ ضمیمہ کی اشاعت سے قبل انکو افادہ عام کیلئے ترجمان القرآن میں درج کیا جا رہا ہے۔ یقیناً "صاحب ترجمان" کی یہ تازہ تحریریں روحانی حیثیت سے ہم سب کیلئے "آدھی ملاقات" کی حیثیت رکھتی ہیں۔ (ادارہ)

قریب کے زمانہ میں دنیا کی فکری امامت اور عملی تدبیر، دونوں ہی کا سررشتہ اہل مغرب کے ہاتھ میں رہا ہے، اس لئے بالکل ایک قدرتی نتیجہ کے طور پر آج کی صورت حال یہ ہے کہ تمدن اور سیاست اور معیشت کے بارے میں ہمارے بیشتر مسائل اور ان مسائل میں ہماری الجھنیں اُن حالات کی پیداوار ہیں جو مغربی زندگی میں انہی مسائل اور انہی الجھنوں کی پیدائش کے موجب ہوئے ہیں، اور اس کے ساتھ یہ بھی اس امامت ہی کا ایک فطری اثر ہے کہ ہمارے سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی اکثریت ان مسائل کے حل کی اُنہی صورتوں میں اپنے لئے رہنمائی تلاش کر رہی ہے جو مغربی مدبرین و مفکرین نے پیش کی ہیں۔ اس بنا پر یہ ناگزیر ہے کہ ہم سب سے پہلے موجودہ عمرانی مسائل کے تاریخی پس منظر پر ایک نگاہ ڈال لیں اور یہ بھی دیکھتے چلیں کہ ان مسائل کے حل کی جو صورتیں آج تجویز یا اختیار کی جا رہی ہیں ان کا شجرہ نسب کیا ہے۔ اس تاریخی

بیان کی روشنی میں وہ مباحث زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آسکیں گے جن پر ہمیں اپنے موضوع کے سلسلہ میں گفتگو کرنی ہے۔

نظام جاگیرداری | پانچویں صدی عیسوی میں جب مغربی رومن امپائر کا نظام درہم برہم ہوا تو یورپ کی تمدنی، سیاسی اور معاشی وحدت بالکل پارہ پارہ ہوگئی جس رشتے نے مختلف قوموں اور ملکوں کو باہم مربوط کر رکھا تھا وہ ٹوٹ گیا، اور جس انتظام نے اس ربط و تعلق کو ممکن بنا رکھا تھا وہ بھی قائم نہ رہا۔ اگرچہ رومی قانون، اور رومی عالمگیریت، اور رومیوں کے سیاسی افکار کا ایک نقش تو اہلِ مغرب کے ذہن پر ضرور باقی رہ گیا، جو آج تک موجود ہے، لیکن سلطنت کے ٹوٹنے سے سارا یورپ بے شمار چھوٹے چھوٹے اجزا میں بٹ گیا۔ ایک ایک جغرافی خطے کے کئی کئی ٹکڑے ہوگئے۔ کہیں کسی ایک نسل کے لوگ اور ایک زبان بولنے والے لوگ بھی اپنی کوئی وحدت قائم نہ کر سکے۔ ساری مملکت تقسیم در تقسیم ہو کر اتنے چھوٹے ٹکڑوں میں متفرق ہوگئی جن کا انتظام مقامی رئیس اور جاگیردار سنبھال سکتے تھے۔ اس طرح یورپ میں اُس نظام زندگی کا آغاز ہوا جس کو اصطلاحاً "نظام جاگیرداری" (Feudal System) کہا جاتا ہے اس نظام میں بتدریج جو خصوصیات پیدا ہوئیں اور آگے چل کر سختی کے ساتھ منجمد ہوتی چلی گئیں وہ یہ تھیں:-

۱۔ بنائے اقتدار ملکیتِ زمین قرار پائی۔ عزت، طاقت، بالادستی، اور مستقل حقوق صرف اُن لوگوں کے لئے مخصوص ہوگئے جو کسی علاقے میں مالکانِ زمین ہوں۔ وہی اپنے علاقے میں امن قائم کرتے تھے۔ انہی سے رئیس یا جاگیردار یا بادشاہ کا براہِ راست تعلق ہوتا تھا۔ انہی کی سرپرستی میں علاقے کے وہ سب لوگ زندگی بسر کرتے تھے جو مالکان زمین کے طبقے سے تعلق نہ رکھتے ہوں، خواہ وہ مزارعین ہوں، یا اہل حرفہ یا اہل تجارت۔ یہ سب گویا رعیت تھے۔ پھر خود اس رعیت میں بھی بہت سے طبقات تھے جن میں سے کوئی اونچا اور کوئی نیچا تھا۔ یہ طبقاتی تقسیم اور اس تقسیم کی بنا پر مراتب، درجات اور حقوق کی تفریق اُس سوسائٹی میں گہری جڑوں کے ساتھ جم گئی تھی۔ اس طرح نظام جاگیرداری کا معاشرہ ایک زینے کی سی شکل اختیار کر گیا تھا جس کی ہر سیڑھی پر بیٹھنے والا اپنے سے نیچے والے کا خدا اور اپنے سے اوپر والے کا بندہ بنا ہوا تھا۔ اس میں سب سے اوپر علاقے کے والیِ ریاست کا خاندان ہوتا تھا اور سب سے نیچے وہ غریب عوام ہوتے تھے جو کسی پر بھی اپنی خدائی کا زور نہ چلا سکتے تھے۔

۲۔ مسیحی کلیسا جو خدا کے نام پر لوگوں سے بات کرتا تھا، مگر جس کے پاس فی الحقیقت کوئی خدائی قانون اور کوئی اصولی ہدایت نامہ موجود نہ تھا، اس وقت یورپ میں نیا نیا قائم ہوا تھا۔ اس نے اِس نوخیز نظام جاگیرداری سے موافقت کرلی اور وہ ان تمام روایتی اداروں اور حقوق اور امتیازات اور پابندیوں کو مذہبی سند عطا کرتا چلا گیا جو اس نظام کے ساتھ ساتھ معاشرے میں جڑ پکڑ رہے تھے۔ ہر خیال جو پرانا ہوگیا، کلیسا کا عقیدہ بن گیا اور اس کے خلاف کچھ سوچنا کفر قرار پایا۔ ہر رسم جو ایک دفعہ پڑ گئی شریعت بن کر رہ گئی اور اس سے انحراف کے معنی خدا اور اس کے دین سے انحراف کے ہوگئے۔ ادب و فلسفہ ہو یا معاشرت اور سیاست اور معیشت، غرض جس چیز کی بھی جو شکل نظام جاگیرداری میں قائم ہوگئی تھی، کلیسا نے اس کو خدا کی دی ہوئی شکل ٹھہرا دیا اور اس بنا پر اس کو بدلنے کی کوشش جرم ہی نہیں، حرام بھی ہوگئی۔

۳۔ چونکہ کوئی ایسا مرکزی اقتدار اور انتظام موجود نہ تھا جو بڑی بڑی شاہراہوں کو تعمیر کرتا اور انہیں درست حالت میں رکھتا اور ان پر امن قائم کرتا، اس لئے دور دراز کے سفر، اور بڑے پیمانے پر تجارت، اور کثیر مقدار میں اشیا ضرورت کی تیاری اور کھپت، غرض اس قسم کی ساری سرگرمیاں بند ہوگئیں اور تجارتیں، صنعتیں اور ذہنیتیں، سب اُن چھوٹے چھوٹے جغرافی خطوں میں سکڑ کر رہ گئیں جن کے حدود اربعہ جاگیرداروں کے اقتدار نے کھینچ رکھے تھے۔

۴۔ صنعت اور تجارت کا ایک ایک شعبہ ایک ایک کاروباری اور پیشہ ور برادری کا اجارہ بن گیا۔ نہ برادری کا کوئی آدمی اپنے پیشے سے نکل سکتا اور نہ کوئی بیرونی آدمی کسی پیشے میں داخل ہوسکتا تھا۔ ہر برادری اپنے کام کو اپنے ہی حلقے میں محدود رکھنے پر مصر تھی۔ مال فوری اور مقامی ضروریات کے لئے تیار ہوتا، آس پاس کے علاقوں ہی میں کھپ جاتا، اور زیادہ تر اجناس کے بدلے اس کا تبادلہ ہوجاتا تھا۔ ان مختلف اسباب نے ترقی، توسیع، ایجاد، فنی اصلاح، اور اجتماعِ سرمایہ کا دروازہ تقریباً بند کر رکھا تھا۔

ان خرابیوں کو، جو رومن امپائر کے زوال و سقوط سے پیدا ہوئی تھیں، ہولی رومن امپائر کے قیام نے کچھ بھی دور نہ کیا۔ پوپ اور قیصر نے چاہے روحانی و اخلاقی اور کسی حد تک سیاسی حیثیت سے پھر ایک رشتۂ وحدت یورپ کو بہم پہنچا دیا ہو، لیکن جاگیرداری نظام میں تمدن و معاشرت اور معیشت کی جو صورت بن

چکی تھی وہ نہ صرف یہ کہ بدلی نہیں، بلکہ ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم ہوگئی کہ اس کے سوا نظام زندگی کی کوئی دوسری صورت گویا سوچی ہی نہ جا سکتی تھی۔

نشاۃ ثانیہ اس جمود کے ٹوٹنے کی ابتدا کس طرح کن اسباب سے ہوئی اور کس طرح یورپ میں وہ ہمہ گیر تحریک اٹھی جو نشاۃ ثانیہ (Renissance) کے نام سے مشہور ہے، یہ بحث ہمارے موضوع سے بہت ہٹی ہوئی ہے۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ ایک طرف ہسپانیہ اور صقلیہ پر مسلمانوں کے قبضے نے اور دوسری طرف صلیبی لڑائیوں نے اہل مغرب کو دنیا کی اُن قوموں سے دوچار کیا جو اس وقت تہذیب و تمدن کی علمبردار تھیں۔ اگرچہ تعصب کے اُس پردے نے جو کلیسا کے اثر سے اہل مغرب کی آنکھوں پر پڑا ہوا تھا، ان لوگوں کو براہ راست اسلام کی طرف تو متوجہ نہ ہونے دیا لیکن مسلمانوں سے جو سابقہ ان کو پیش آیا اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ خیالات، معلومات اور ترقی یافتہ طریقوں کی ایک وسیع دولت ان کے ہاتھ آئی اور وہی آخرکار ایک نئے دور کے آغاز کی موجب ہوئی۔

چودھویں صدی سے لے کر سولھویں صدی تک کا زمانہ یورپ کی تاریخ میں دور متوسط سے دور جدید کی طرف عبور کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں مغربی زندگی کا ہر پہلو اُن اثرات کی وجہ سے حرکت میں آگیا جو بیرونی دنیا سے در آمد ہو رہے تھے۔ طبعیات، طب، ریاضی، انجینیرنگ اور دوسرے شعبوں میں اہل مغرب کا علم بڑھنا شروع ہوا۔ پریس کی ایجاد نے اشاعتِ خیالات اور اشاعت علم کی رفتار تیز کر دی۔ علمی بیداری کے ساتھ لازماً ہر شعبۂ حیات میں تنقید و اصلاح کا سلسلہ چل پڑا۔ نئے فنون کی واقفیت نے صنعت، زراعت، تجارت، اور عام طور پر پورے تمدن میں جان ڈال دی۔ پھر نئی جغرافی دریافتوں سے فکر و نظر میں بھی وسعت پیدا ہونے لگی اور اس کے ساتھ اہل مغرب کے لئے دور دراز کے ملکوں میں ایسی منڈیاں بھی کھلنی شروع ہوگئیں جہاں وہ اپنے ملک کی مصنوعات اور خام پیداوار نکال سکیں اور دوسرے ملکوں کی مصنوعات اور خام پیداوار خرید سکیں۔ ان مواقع سے تجارت کا وہ بازار جو صدیوں سے سرد پڑا ہوا تھا، از سر نو گرم ہونے لگا۔ تمام رکاوٹوں کے باوجود یورپ کے اندر بھی اور باہر بھی سوداگری کا روبار پھیلنا شروع ہوا۔ بڑے بڑے تجارتی چوراہوں پر شہر بستے اور بڑھتے چلے گئے۔ دولت، طاقت، ذہانت، تہذیب اور تمدن کا مرکز بتدریج جاگیروں اور ریاستوں کے قصباتی صدر مقامات سے ہٹ کر ان بڑے بڑے شہروں کی طرف

سرکنے لگا جو تجارت اور صنعت اور جدید علمی و ادبی حرکت کے مرکز بن رہے تھے۔

اس نئی حرکت کے میر کارواں وہ بورژوا طبقہ کے لوگ (یعنی سوداگر، ساہوکار، اہل حرفہ، اور بحری تجار وغیرہ) تھے جو ترقی کے ان مواقع سے مستفید ہوئے تھے، شہروں میں آباد تھے، باہر آمد و رفت رکھتے تھے یا کم از کم باہر سے آنے والے اثرات کی زد میں تھے، اور جن کے اندر تغیر اور ترقی کی ایک لگن پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن ان لوگوں کے ابھرنے اور آگے بڑھنے میں ہر طرف سے ان فکری، اخلاقی، مذہبی، معاشرتی اور سیاسی و معاشی بندشوں نے سخت روکاوٹیں حائل کر رکھی تھیں جو کلیسا اور جاگیر داری کے گٹھ جوڑ سے قائم ہوئی تھیں۔ زندگی کے جس شعبے میں بھی یہ لوگ صدیوں کے بنے اور جمے ہوئے دائروں سے قدم باہر نکالتے، پادری اور جاگیردار، دونوں مل کر ان کا راستہ روک لیتے تھے۔ اس بنا پر ان دونوں طاقتوں کے خلاف ایک ہمہ گیر کشمکش کا آغاز ہوا اور ایک چومکھی لڑائی ہر میدان میں چھڑ گئی۔ علم و ادب کے میدان میں کلیسا کے عائد کردہ ذہنی استبداد کو چیلنج کیا گیا اور آزادیِ فکر و تحقیق کے حق پر زور دیا گیا۔ معیشت اور معاشرت اور سیاست کے میدان میں جاگیر داروں کے اقتدار کو چیلنج کیا گیا اور ان سارے امتیازات کے خلاف آواز اٹھائی گئی جو نظام جاگیر داری کے تحت قائم تھے۔ آہستہ آہستہ یہ جنگ پرانے نظام کی پسپائی اور ان نو خیز طاقتوں کی پیش قدمی پر منتج ہوتی چلی گئی اور سولہویں صدی تک پہنچتے پہنچتے نوبت یہ آ گئی کہ یورپ کے مختلف ملکوں میں چھوٹی چھوٹی جاگیر داریاں ٹوٹ ٹوٹ کر بڑی بڑی قومی ریاستوں میں جذب ہونے لگیں، پوپ کے روحانی تسلط کا طلسم ٹوٹ گیا، نئی قومی ریاستوں کے غیر مذہبی حکمرانوں نے کلیسا کی املاک ضبط کرنی شروع کر دیں، ایک عالمگیر مذہبی نظام کو چھوڑ کر مختلف قوموں نے اپنے اپنے الگ قومی کلیسا بنانے شروع کر دیئے جو قومی ریاستوں کے حریف یا شریک و سہیم ہونے کے بجائے ان کے دست نگر تھے، اور اس طرح چرچ اور جاگیر داری کے مشترک غلبے کی بندشیں ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ بورژوا طبقہ ان معاشرتی اور روایتی رکاوٹوں سے آزاد ہوتا چلا گیا جو اس پرانے نظام نے اسکی راہ میں حائل کر رکھی تھیں۔

دورِ متوسط کا لبرلزم کلیسا اور جاگیر داری کے خلاف یہ جنگ جن نظریات کی بنا پر لڑی گئی ان کا سر عنوان تھا "لبرلزم" یعنی وسیع المشربی۔ نئے دور کے علمبردار زندگی کے ہر شعبے اور فکر و عمل کے ہر میدان میں وسعتِ مشرب، فیاضی، فراخ دلی اور کشادگی کا وعظ کہتے تھے، عام اس سے کہ وہ مذہب اور فلسفے اور علم و فن کے میدان ہوں، یا معاشرت

اور تمدن اور سیاست اور معیشت کے میدان - وہ ترقی پسند انسان کے راستے سے ہر طرف بندشوں اور رکاوٹوں اور تنگیوں اور سختیوں کو دور کر دینا چاہتے تھے۔

اس کشمکش میں اگر اہل کلیسا اور جاگیرداروں کی تنگ خیالی ایک انتہا پر تھی تو ان بورژوا حضرات کی وسعتِ مشرب دوسری انتہا کی طرف چلی جا رہی تھی - دونوں طرف خود غرضیاں کار فرما تھیں۔ حق اور انصاف اور علم صحیح اور فکر صالح سے دونوں کو کچھ واسطہ نہ تھا۔ ایک گروہ نے اگر بےاصل عقائد، ناروا امتیازات اور زبردستی کے قائم کردہ حقوق کی مدافعت میں خدا اور دین اور اخلاق کا نام استعمال کیا، تو دوسرے گروہ نے اس کی ضد میں آزاد خیالی اور وسیع المشربی کے نام سے مذہب و اخلاق کی اُن صداقتوں کو بھی متزلزل کرنا شروع کر دیا جو ہمیشہ سے مسلّم چلی آرہی تھیں - یہی زمانہ تھا جس میں سیاست کا رشتہ اخلاق سے توڑا گیا اور میکیاویلی نے کھلم کھلا اس نظریہ کی وکالت کی کہ سیاسی اغراض و مصالح کے معاملہ میں اخلاقی اصولوں کا لحاظ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں - یہی زمانہ تھا جس میں کلیسا اور جاگیرداری کے بالمقابل قومیت اور قوم پرستی اور قومی ریاست کے بت تراشے گئے اور اُس فتنے کی بنا ڈالی گئی جس کی بدولت آج دنیا لڑائیوں اور قومی عداوتوں کا ایک کوہ آتش فشاں بنی ہوئی ہے - اور یہی وہ زمانہ تھا جس میں پہلی مرتبہ سود کے جائز و مباح ہونے کا تخیل پیدا ہوا، حالانکہ قدیم ترین زمانے سے تمام دنیا کے اہلِ دین و اخلاق اور علمائے قانون اس چیز کی حرمت پر متفق تھے، صرف تورات اور قرآن ہی نے اس کو حرام نہیں ٹھہرایا تھا بلکہ ارسطو اور افلاطون بھی اس کی حرمت کے قائل تھے، اور یونان اور روم کے قوانین میں بھی یہ چیز ممنوع تھی۔ لیکن نشاۃ ثانیہ کے دور میں جب بورژوا طبقہ نے مسیحی کلیسا کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا تو پہلے سود کو ایک ناگزیر برائی کہنا شروع کیا گیا یہاں تک کہ اس پر زور پروپیگنڈا سے مرعوب ہو کر مسیحی متجددین (Reformists) بھی اس کو انسانی کمزوری کے عذر کی بنا پر "اضطراراً" جائز ٹھہرانے لگے، پھر رفتہ رفتہ ساری اخلاقی گفتگو صرف شرحِ سود پر مرکوز ہو گئی اور ممتاز اہلِ فکر اپنا سارا زور اس بحث پر صرف کرنے لگے کہ سود کی شرح "معقول" ہونی چاہیے، اور آخر کار یہ تخیل جڑ پکڑ گیا کہ مذہب و اخلاق کو کاروباری معاملات سے کیا غرض، معاشی حیثیت سے سود سراسر ایک فطری اور معقول چیز ہے جس طرح کرائیہ مکان کے خلاف کچھ نہیں کہا جا سکتا اسی طرح سود کے خلاف بھی کوئی عقلی دلیل موجود نہیں ہے!

لطف یہ ہے کہ نشاۃ ثانیہ ہی کے دور میں اس بورژوا طبقے نے اپنی اس وسیع المشربی کا صور پھونک پھونک کر پادریوں اور جاگیرداروں اور مالکان زمین کے قبضے سے جتنا میدان نکالا اس کے وہ تنہا خود ہی "حق دار" بنتے چلے گئے۔ ان کی وسیع المشربی نے ان کو یہ یاد نہ دلایا کہ ان سے فروتر ایک اور طبقہ عوام الناس کا بھی موجود ہے جو جاگیرداری نظام میں ان کی بہ نسبت زیادہ مظلوم تھا، اور اب اس لبرل نظام کے فوائد میں سے وہ بھی حصہ پانے کا حق رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر جب انگلستان میں پارلیمنٹری طرزِ حکومت کی بناء پڑی اور پارلیمنٹ میں اصل اقتدار اُمراء (لارڈس) کے ہاتھ سے نکل کر "عوام" (کامنز) کے ہاتھ میں آیا تو اس سارے اقتدار کو اپنی وسیع المشربی بورژوا حضرات نے اچک لیا۔ جن دلائل سے انہوں نے اپنے لئے ووٹ کا حق حاصل کیا تھا وہ دلائل نچلے طبقے کے عوام کو ووٹ کا حق دینے سے انکار کرتے وقت ان کو یاد نہ آئے۔

صنعتی انقلاب اٹھارویں صدی عیسوی میں مشین کی ایجاد نے اس انقلاب کی رفتار کو بدرجہا زیادہ تیز کر دیا جس کی ابتدا نشاۃ ثانیہ کے دور میں ہوئی تھی۔ نئی سائنٹفک معلومات اور ایجادات کو جب صنعت و حرفت، زراعت، اور وسائل آمد و رفت کی ترقی میں استعمال کیا گیا تو نئے بڑے پیمانے پر مصنوعات کی تیاری، خام پیداوار کی فراہمی اور دنیا کے گوشے گوشے میں تیار مال کی کھپت کا سلسلہ چل پڑا جس کا تصور بھی اس سے پہلے کبھی نہ کیا گیا تھا۔

اس عظیم الشان انقلاب سے ترقی، خوشحالی اور قوت و اقتدار کے جن مواقع کا دروازہ کھولا ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے قریب ترین گروہ اگر کوئی تھا تو وہی "بورژوا" گروہ تھا جو نشاۃ ثانیہ کے دور میں ابھر آیا تھا۔ کیونکہ صنعت و تجارت اسی کے ہاتھ میں تھی، سرمایہ بھی اسی کے پاس تھا، اور علم و ادب پر بھی وہی چھایا ہوا تھا۔ اس نے سرمایہ اور فنی قابلیت اور تنظیمی صلاحیت، تینوں کے اشتراک سے صنعت اور کاروبار کا ایک نیا نظام بنا کھڑا کیا جسے "جدید نظامِ سرمایہ داری" کہا جاتا ہے۔ اس نظام کے تحت شہروں میں بڑے بڑے کارخانے اور تجارتی ادارے قائم ہوئے۔ پیشہ ور برادریوں کے پرانے حلقے ٹوٹ گئے۔ چھوٹے چھوٹے کارخانوں اور منفرد کاریگروں اور چھوٹی پونجی والے دوکانداروں کے لئے دائرہ زندگی تنگ ہو گیا۔ دیہات و قصبات کے پیشہ ور لوگ مجبور ہو گئے کہ شہروں میں آئیں اور ان بڑے کارخانہ داروں کے دروازے پر مزدور کی حیثیت سے جا کھڑے

ہوں۔ اور چھوٹے موٹے سوداگر اور کاروباری لوگ بھی مجبور ہو گئے کہ ان بڑے صناعوں اور تاجروں کی ملازمت یا ایجنسی قبول کرلیں۔ اس طرح سائنس کی نئی دریافتوں سے جو طاقت آئی تھی اسے بورژوا طبقے نے اچک لیا اور اپنی فتوحات کا دائرہ پھیلانا شروع کر دیا۔

اس دائرے کے پھیلاؤ میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ قومی ریاستیں تھیں جو نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے نتیجہ میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان ریاستوں کے مطلق العنان بادشاہ "خداداد حق" کے مدعی تھے۔ سابق جاگیرداری نظام کے امراء ان بادشاہوں کی "پائیگاہ" بن گئے تھے، اور قومی کلیسا ان کے لئے مذہبی و روحانی پشت پناہ تھے۔ سارا سیاسی اقتدار اسی تثلیث کے قبضے میں تھا، اور بورژوا طبقے کے لئے اس تثلیث کی فرمانروائی طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتی تھی۔ اس کی ڈالی ہوئی رکاوٹیں نہ صرف صنعت اور تجارت کے میدان میں اس طبقے کی پیشقدمی کو روکتی تھیں، بلکہ تمدن اور معاشرت میں بھی دورِ جاگیرداری کے وہ بہت سے باقیات ابھی موجود تھے جو اس نوخیز طبقے کو ناگوار تھے۔

جدید لبرلزم

اس دور میں وہی لبرلزم، جس نے پچھلی لڑائی جیتی تھی نئے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اٹھا اور اس نے سیاسیات میں جمہوریت کا، اور معاشرت اور تمدن اور اخلاق اور ادب میں انفرادی آزادی کا، اور معاشیات میں بے قیدی (Laissezpaire Policy) کا صور پھونکنا شروع کیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ چرچ ہو، یا اسٹیٹ یا سوسائٹی کسی کو بھی فرد کی سعیِ ارتقاء، اور سعیِ انتفاع میں رکاوٹیں عائد کرنے کا حق نہیں ہے۔ ہر شخص کو بالکل آزادی کے ساتھ یہ موقع حاصل ہونا چاہیئے کہ اپنی قوتوں اور قابلیتوں کو اپنے رجحانات کے مطابق استعمال کرے اور جتنا آگے بڑھ سکتا ہے بڑھتا چلا جائے۔ خود سوسائٹی کے مفاد کی بھی بہترین خدمت اس طرح ہو سکتی ہے کہ اس کے ہر فرد کو غیر محدود آزادی حاصل ہو۔ ہر شعبۂ حیات اور ہر راہِ عمل میں مکمل آزادی ہر خارجی رکاوٹ سے، ہر رسمی قید سے، ہر مذہبی و اخلاقی بندش سے، اور ہر قانونی یا اجتماعی مداخلت سے پوری آزادی۔ اس طرح اس نظریہ کے حامیوں نے ہر طرف رواداری، بے قیدی، اباحیت، انفرادیت، اور قصہ مختصر یہ کہ اپنی اصطلاحِ خاص میں "معقولیت" کو برسرِ کار لانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

سیاسیات میں ان کا مطالبہ یہ تھا کہ حکومت کے اختیارات کم سے کم ہوں اور فرد کی آزادی کے حدود زیادہ

زیادہ۔ حکومت صرف ایک عدل قائم کرنے والی ایجنسی ہو جو افراد کو ایک دوسرے کے حدود میں دخل اندازی ہونے سے روکتی رہے اور انفرادی آزادی کی حفاظت کرے۔ باقی رہی تمدنی و معاشی زندگی، تو اس کا سارا کاروبار افراد کی آزادانہ سعی و عمل اور فکر و تدبر کے بل پر چلنا چاہیئے۔ اس میں حکومت کو نہ عامل کی حیثیت ہی سے دخل دینے کی کوئی ضرورت ہے اور نہ رہنما ہی کی حیثیت سے۔ اس کے ساتھ سیاسیات میں وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ حکمرانی کا اقتدار نہ تو کسی شاہی خاندان کی ملک رہے۔ اور نہ چند زمیندار گھرانوں کا اجارہ بن کر رہ جائے۔ ملک عام باشندوں کا ہے۔ حکومت کا سارا کاروبار انہی کے دیئے ہوئے ٹیکسوں سے چلتا ہے۔ لہٰذا انہی کی رائے سے حکومتیں بنی اور ٹوٹنی اور بدلنی چاہئیں اور انہی کی آواز کو قانون سازی اور نظم و نسق میں فیصلہ کن اثر حاصل ہونا چاہیئے —— یہی نظریات اُن جدید جمہوریتوں کی بنیاد بنے جو اٹھارویں صدی کے آخر سے دنیا میں قائم ہونی شروع ہوئیں۔

معاشیات میں جس اصول پر انہوں نے زور دیا وہ یہ تھا کہ اگر فطری قوانین معیشت کو خارجی مداخلت اور دخل اندازی کے بغیر خود کام کرنے دیا جائے تو افراد کی انفرادی کوششوں سے آپ ہی آپ اجتماعی فلاح کی بڑی سے بڑی خدمت انجام پاتی چلی جائیں گی۔ پیداوار زیادہ سے زیادہ ہو گی اور اس کی تقسیم بھی بہتر سے بہتر طریقہ پر ہوتی رہیگی، بشرطیکہ لوگوں کو سعی و عمل کی آزادی حاصل رہے اور حکومت اس فطری عمل میں مصنوعی طور پر مداخلت نہ کرے۔ بے قید معیشت کا یہی اصول جدید نظام سرمایہ داری کا بنیادی فارمولا قرار پایا۔

اس میں شک نہیں کہ نشأۃ جدید کے دور کی وسیع المشربی کی طرح صنعتی انقلاب کے دور کی وسیع المشربی بھی اپنے اندر صداقت کے کچھ عناصر رکھتی تھی اور یہی عناصر آخر کار اسکی فتح یابی کے موجب ہوئے۔ لیکن یہاں پھر مغربی ذہن کی وہی وہ بنیادی کمزوریاں اس صداقت کے ساتھ بھی لگی ہوئی تھیں جن کو پاپائی و جاگیرداری کے دور سے ہم برابر کار فرما دیکھتے چلے آ رہے ہیں یعنی خود غرضی اور انتہا پسندی۔

خود غرضی کا کرشمہ یہ تھا کہ ان میں سے اکثر کے مطالبۂ حق و انصاف میں کوئی خلوص نہ تھا۔ جو صحیح اصول وہ پیش کرتے تھے ان کی اصل محرک حق پسندی نہ تھی بلکہ صرف یہ بات تھی کہ وہ ان کی اغراض کے لئے مفید تھے۔ اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ جن حقوق کا خود اپنے لئے مطالبہ کرتے تھے وہی حقوق اپنے مزدوروں اور نادار عوام کو دینے کے لئے تیار نہ تھے۔

وہی انتہا پسندی، تو وہ ان کے مخلص اہل علم اور اہل قلم حضرات کی بات بات میں نمایاں تھی۔ چند صداقتوں کو انہوں نے لیا اور انہیں ان کی حد سے بہت زیادہ بڑھا دیا۔ چند دوسری صداقتوں کو انہوں نے نظر انداز کر دیا اور زندگی میں جو مقام اُن کے لئے تھا اُس میں بھی اپنی منظورِ نظر صداقتوں کو لا بٹھایا۔ حالانکہ ہر صداقت اپنی حد سے نکل جانے کے بعد جھوٹ بن جاتی ہے اور اُلٹے نتائج دکھانے لگتی ہے۔ یہ افراط و تفریط اُس نظامِ حیات کے سارے ہی گوشوں میں پائی جاتی ہے جو "بے قیدی"، "انفرادیت" اور "جمہوریت" کے اِن نظریات کے زیرِ اثر مرتب ہوا۔ لیکن اس وقت ہمارا موضوع چونکہ خاص طور پر معیشت کا گوشہ ہے، اس لئے ہم دوسرے گوشوں کو چھوڑتے ہوئے صرف اِسی گوشے کا جائزہ لے کر یہ دکھائیں گے کہ فطری قوانینِ معیشت کے ساتھ خود غرضی اور انتہا پسندی کی آمیزش سے کس قسم کا غیر متوازن نظامِ معاشی ان لوگوں نے بنایا اور اُس سے کیا نتائج برآمد ہوئے:

---

(۲)

جدید نظام سرمایہ داری

جیسا کہ ابھی ہم اشارہ کر چکے ہیں، بے قید معیشت کے وسیع المشرب نظریہ پر جس معاشی نظام کی عمارت اٹھی، اس کا نام اصطلاح میں جدید نظام سرمایہ داری (Modern Capitalism) ہے۔

بے قید معیشت کے اصول اس نظام کے بنیادی اصول حسب ذیل ہیں:۔

(۱) شخصی ملکیت کا حق۔ صرف انہی اشیاء کی ملکیت کا حق نہیں جنہیں آدمی خود استعمال کرتا ہے مثلاً کپڑے، برتن، فرنیچر، مکان، سواری، مویشی وغیرہ۔ بلکہ ان اشیاء کی ملکیت کا حق بھی جن سے آدمی مختلف قسم کی اشیاء ضرورت پیدا کرتا ہے تاکہ انہیں دوسروں کے ہاتھ فروخت کرے۔ مثلاً مشین، آلات، زمین، خام مواد وغیرہ۔ پہلی قسم کی چیزوں پر تو بلانزاع ہر نظام میں انفرادی حقوقِ ملکیت تسلیم کئے جاتے ہیں، لیکن بحث ان دوسری قسم کی اشیاء یعنی ذرائع پیداوار کے معاملہ میں اٹھ کھڑی ہوئی ہے، کہ آیا ان پر بھی انفرادی ملکیت کا حق جائز ہے یا نہیں۔ نظام سرمایہ داری کی اولین امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس حق کو تسلیم کرتا ہے، بلکہ درحقیقت یہی حق اس نظام کا سنگِ بنیاد ہے۔

(۲) آزادی سعی کا حق۔ یعنی افراد کا یہ حق کہ وہ فرداً فرداً، یا چھوٹے بڑے گروہوں کی شکل میں مل کر اپنے ذرائع کو جس میدانِ عمل میں چاہیں استعمال کریں۔ اس کوشش کے نتیجہ میں جو فوائد حاصل ہوں یا جو نقصانات پہنچیں دونوں انہی کے لئے ہیں۔ نقصان کا خطرہ بھی وہ خود ہی برداشت کریں گے، اور ان کے فائدے پر بھی کوئی پابندی عاید نہیں کی جاسکتی۔ ان کو پوری آزادی ہے کہ اپنی پیداوار اور اشیاء کی تیاری کو جس قدر چاہیں بڑھائیں یا گھٹائیں، اپنے مال کی جو قیمت چاہیں رکھیں، جتنے آدمیوں سے چاہیں اجرت پر یا تنخواہ پر کام لیں، اپنے کاروبار کے سلسلے میں جو شرائط اور جو ذمہ داریاں چاہیں قبول کریں، اور جو ضابطے چاہیں بنائیں۔ بائع اور مشتری اجیر اور مستاجر، مالک اور نوکر کے درمیان کاروبار کی حد تک سارے معاملات آزادانہ طے ہونے چاہئیں، اور جن شرائط پر بھی ان کی باہمی قرارداد ہو جائے اسے نافذ ہونا چاہئے۔

(۳) ذاتی نفع کا محرک عمل ہونا۔ نظام سرمایہ داری اشیاء ضرورت کی پیداوار اور ترقی کے لئے جس چیز پر انحصار کرتا ہے وہ فائدے کی طمع اور نفع کی امید ہے جو ہر انسان کے اندر فطرۃً موجود ہے اور اسکو سعی و عمل پر ابھارتی ہے۔ نظام سرمایہ داری کے حامی کہتے ہیں کہ انسانی زندگی میں اس سے بہتر بلکہ اس کے سوا کوئی دوسرا محرک عمل فراہم نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نفع کے امکانات جس قدر کم کر دیں گے اسی قدر آدمی کی جدوجہد اور محنت کم ہو جائے گی۔ نفع کے امکانات کھلے رکھئے اور ہر شخص کو موقع دیجئے کہ اپنی محنت و قابلیت سے جتنا کما سکتا ہے کمائے، ہر شخص خود زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر کام کرنے کی کوشش کرنے لگے گا۔ اس طرح آپ سے آپ پیداوار بڑھیگی، اس کا معیار بھی بلند ہوتا جائے گا، تمام ممکن ذرائع و وسائل استعمال میں آتے چلے جائیں گے، اشیاء ضرورت کی بہم رسانی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا اور ذاتی نفع کا لالچ افراد سے اجتماعی مفاد کی وہ خدمت خود ہی لے لیگا جو کسی دوسری طرح اُن سے نہیں لی جا سکتی۔

(۴) مقابلہ اور مسابقت۔ نظام سرمایہ داری کے وکلاء کہتے ہیں کہ یہی وہ چیز ہے جو بے قید معیشت میں افراد کی خود غرضی کو بے جا حد تک بڑھنے سے روکتی ہے اور ان کے درمیان اعتدال و توازن قائم کرتی رہتی ہے۔ یہ انتظام فطرت نے خود ہی کر دیا ہے۔ کھلے بازار میں جب ایک ہی جنس کے بہت سے تیار کرنے والے، بہت سے سوداگر اور بہت سے خریدار ہوتے ہیں تو مقابلے میں آکر کسر و انکسار سے خود ہی قیمتوں کا ایک مناسب معیار قائم ہو جاتا ہے اور نفع اندوزی نہ مستقل طور پر حد سے بڑھنے پاتی ہے نہ حد سے گھٹ سکتی ہے، اتفاقی اتار چڑھاؤ کی بات دوسری ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کام کرنے والے اور کام لینے والے بھی اپنی اپنی جگہ مقابلے کی بدولت خود ہی اجرتوں اور تنخواہوں کے متوازن معیار قائم کرتے رہتے ہیں بشرطیکہ مقابلہ کھلا اور آزادانہ ہو اور کسی قسم کی اجارہ داریوں سے اسکو تنگ نہ کر دیا جائے۔

(۵) اجیر اور مستاجر کے حقوق کا فرق۔ نظام سرمایہ داری میں ہر کاروباری ادارے کے کارکن دو فریقوں پر منقسم ہوتے ہیں۔ ایک مالک، جو اپنی ذمہ داری پر کسی تجارت یا صنعت کو شروع کرتے ہیں، اور چلاتے ہیں، اور آخر تک اس کے نفع و نقصان کے ذمہ دار رہتے ہیں۔ دوسرے مزدور یا ملازم، جن کو نفع اور نقصان سے کچھ سروکار نہیں ہوتا، وہ بس اپنا وقت اور اپنی محنت و قابلیت اس کاروبار میں صرف کرتے ہیں اور اس کی ایک طے شدہ اجرت لیتے ہیں۔ بسا اوقات کاروبار میں مسلسل گھاٹا آتا رہتا ہے مگر اجیر اپنی اجرت لئے جاتا ہے۔ بسا اوقات کاروبار بالکل بیٹھ

جاتا ہے جس میں مالک تو بالکل برباد ہو جاتا ہے مگر اجیر کے لئے بس اتنا فرق پڑتا ہے کہ آج اس دوکان یا کارخانے میں کام کر رہا تھا تو کل دوسری جگہ جا کھڑا ہوا۔ نظام سرمایہ داری کے حامی کہتے ہیں کہ معاملہ کی یہ نوعیت آپ ہی یہ بات طے کر دیتی ہے کہ از روئے انصاف کاروبار کا منافع اُس کا حصہ ہے جس کے حصے میں کاروبار کا نقصان آتا ہے اور جو کاروبار کا خطرہ مول لیتا ہے۔ رہا اجیر، تو وہ اپنی مناسب اجرت لینے کا حق دار ہے جو معروف طریقہ پر اس کے کام کی نوعیت اور مقدار کے لحاظ سے مارکیٹ کی شرح کے مطابق طے ہو جائے۔ اس اجرت کو نہ تو اس دلیل کی بنا پر بڑھنا ہی چاہیئے کہ کاروبار میں منافع ہو رہا ہے، اور نہ اس دلیل سے گھٹنا چاہیئے کہ کاروبار میں گھاٹا آ رہا ہے۔ اجیر کا کام اسکو طے شدہ اجرت کا بہر حال مستحق بناتا ہے، اور بس طے شدہ اجرت ہی کا مستحق بناتا ہے۔ ان اجرتوں میں کمی بیشی اگر ہوگی تو اُس فطری قانون کے تحت ہوتی رہے گی جس کے تحت دوسری تمام اشیاء کی قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ کام لینے والے کم اور کام کے خواہشمند زیادہ ہوں گے تو اجرتیں آپ سے آپ کم ہوں گی۔ کام کرنے والے کم اور کام لینے والے زیادہ ہوں گے تو اجرتیں خود بڑھ جائیں گی۔ اچھے اور ہوشیار کارکن کا کام آپ سے آپ زیادہ اجرت لائے گا اور کاروبار کا مالک خود اپنے ہی فائدے کی خاطر اسکو انعام اور ترقی دے دے کر خوش کرتا رہے گا۔ خود کارکن بھی جیسی کچھ اجرت پائے گا ویسی ہی وہ کاروبار کی ترقی و بہتری میں جان لڑائے گا۔ مالکوں کی خواہش فطرۃً یہ ہوگی کہ لاگت کم سے کم اور منافع زیادہ سے زیادہ ہو، اس لیے وہ اجرتیں کم رکھنے پر مائل ہوں گے۔ کارکن فطرۃً یہ چاہیں گے کہ ان کی ضروریات زیادہ سے زیادہ فراغت کے ساتھ پوری ہوں اور ان کا معیار زندگی بھی کچھ نہ کچھ بلند ہوتا رہے، اس لئے وہ ہمیشہ اجرتیں بڑھوانے کے خواہشمند رہیں گے۔ اس تضاد سے ایک گونہ کشمکش پیدا ہونی ایک قدرتی بات ہے۔ لیکن جس طرح دنیا کے ہر معاملہ میں ہوا کرتا ہے، اس معاملہ میں بھی فطری طور پر کسر و انکسار سے ایسی اجرتیں طے ہوتی رہیں گی جو فریقین کے لئے قابل قبول ہوں۔

(۴) ارتقاء کے فطری اسباب پر اعتماد: نظام سرمایہ داری کے وکیل کہتے ہیں کہ جب کاروبار میں منافع کا سارا انحصار ہی اس پر ہے کہ لاگت کم اور پیداوار زیادہ ہو، تو کاروباری آدمی کو اس کا اپنا ہی مفاد اس بات پر مجبور کرتا رہتا ہے کہ پیداوار بڑھانے کے لئے زیادہ سے زیادہ بہتر سائنٹفک طریقے اختیار کرے، اپنی مشینوں اور آلات کو زیادہ سے زیادہ اچھی حالت میں رکھے، خام مواد بڑی مقدار میں کم قیمت پر حاصل کرے، اور اپنے کاروبار کے طریقوں کو اور اپنی تنظیمات کو ترقی دینے میں ہر وقت دماغ لڑاتا رہے۔ یہ سب کچھ کسی بیرونی مداخلت اور مصنوعی تدبیر کے بغیر، بے قید معیشت کی اندرونی

منسلق خود ہی کراتی چلی جاتی ہے۔ فطرت کے قوانین کثیر التعداد منتشر افراد اور گروہوں کی انفرادی سعی و عمل سے اجتماعی ترقی و خوشحالی کا وہ کام آپ ہی آپ لیتے رہتے ہیں جو کسی اجتماعی منصوبہ بندی سے اتنی خوبی کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ یہ فطرت کی منصوبہ بندی ہے جو غیر محسوس طور پر عمل میں آتی ہے۔

(۷) ریاست کی عدم مداخلت۔ اس نظام کے حامیوں کا کہنا یہ ہے کہ مذکورۂ بالا اصولوں پر سوسائٹی کی فلاح و بہبود کا بہترین کام اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ افراد کو بلا کسی قید و بند کے آزادانہ کام کرنے کا موقع حاصل ہو۔ فطرت نے معاشی قوانین میں ایک ایسی ہم آہنگی رکھ دی ہے کہ جب وہ سب مل جل کر کام کرتے ہیں تو نتیجہ میں سب کی بھلائی حاصل ہوتی ہے، حالانکہ ایک ایک فرد اپنے ہی ذاتی نفع کے لئے سعی کر رہا ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر دکھایا جا چکا ہے، جب افراد کو اپنی سعی کا صلہ غیر محدود منافع کی شکل میں ملتا نظر آتا ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کرنے کے لئے اپنی ساری قوت و قابلیت صرف کر دیتے ہیں۔ اس سے لامحالہ سب لوگوں کے لئے اچھے سے اچھا مال وافر سے وافر مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ کھلے بازار میں جب تاجروں اور صناعوں اور خام پیداوار بہم پہنچانے والوں کا مقابلہ ہوتا ہے تو قیمتوں کا اعتدال آپ سے آپ قائم ہوتا ہے، اشیاء کا معیار آپ سے آپ بلند ہوتا جاتا ہے اور خود ہی معلوم ہوتا رہتا ہے کہ سوسائٹی کو کن چیزوں کی کتنی ضرورت ہے۔ اس سارے کاروبار میں ریاست کا کام یہ نہیں ہے کہ پیدائش دولت کے فطری عمل میں خواہ مخواہ مداخلت کر کے اس کا توازن بگاڑے، بلکہ اس کا کام صرف یہ ہے کہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں انفرادی آزادی عمل زیادہ سے زیادہ محفوظ ہو سکے۔ اسے امن اور نظم قائم کرنا چاہیئے، حقوق ملکیت کی حفاظت کرنی چاہیئے، معاہدوں کو قانون کے زور سے پورا کرانا چاہیئے اور بیرونی حملوں اور دوسرے خطروں سے ملک کو اور ملک کے کاروبار کو بچانا چاہیئے۔ ریاست کا منصب یہ ہے کہ منصف اور نگران اور محافظ کی خدمت انجام دے، نہ یہ کہ خود تاجر اور صناع اور زمیندار بن بیٹھے، یا تاجروں اور صناعوں اور زمینداروں کو اپنی بار بار کی دخل اندازی سے کام کرنے دے۔

خرابی کے اسباب یہ تھے وہ اصول جن کو پورے زور و شور کے ساتھ جدید سرمایہ داری کی پیدائش کے زمانہ میں پیش کیا گیا، اور چونکہ ان کے اندر کسی حد تک مبالغہ کے باوجود صداقت پائی جاتی تھی، اس لئے ان کو بالعموم دنیا بھر سے تسلیم کرا لیا گیا۔ درحقیقت ان میں نئی بات کوئی بھی نہ تھی۔ ساری باتیں وہی تھیں جن پر غیر معلوم زمانے سے

انسانی معیشت کا کاروبار انجام پاتا چلا آرہا تھا۔ جدت اگر تھی تو اُس مبالغہ آمیز شدت میں تھی جو بعض اصولوں کو صنعتی انقلاب کے دور کی معیشت پر چسپاں کرنے میں بورژوا حضرات نے اختیار کی۔ مزید برآں انہوں نے اپنا سارا نظام صرف اُن فطری اصولوں ہی پر نہیں اٹھایا جن کا اوپر ذکر ہوا ہے بلکہ ان کے ساتھ کچھ غلط اصولوں کی آمیزش بھی کر دی۔ پھر انہوں نے بعض دوسرے ایسے اصولوں کو نظر انداز بھی کر دیا جو ایک فطری نظام معیشت کے لئے اُتنے ہی اہم ہیں جتنے آزاد معیشت کے مذکورۂ بالا اصول۔ اس کے ساتھ انہوں نے اپنی خود غرضیوں سے خود اپنے ہی پیش کردہ بعض اصولوں کی نفی بھی کر دی۔ یہی چاروں چیزیں مل جل کر اُن خرابیوں کی موجب ہوئیں جو بالآخر جدید سرمایہ داری میں پیدا ہوتی چلی گئیں اور اس حد تک بڑھیں کہ دنیا میں اس کے خلاف ایک عام شورش برپا ہو گئی۔

مختصراً ہمیں ان اسباب کا بھی جائزہ لے لینا چاہیئے۔

(۱) بے قید معیشت کی حمایت میں جن "فطری قوانین" کا یہ لوگ بار بار حوالہ دیتے رہے ہیں وہ اس مبالغہ کی حد تک صحیح نہیں ہیں جو ان لوگوں نے نہ صرف اپنے بیان میں، بلکہ اپنے عمل میں برتنا چاہا۔ لارڈ کینز نے بالکل سچ کہا ہے کہ "دنیا پر اخلاقی و فطری قوانین کی ایسی مضبوط حکومت قائم نہیں ہے جس کے زور سے افراد کے ذاتی مفاد اور سوسائٹی کے اجتماعی مفاد میں ضرور آپ ہی آپ موافقت ہوتی رہے۔ معاشیات کے اصولوں سے یہ استنباط کوئی صحیح استنباط نہیں ہے کہ روشن خیال خود غرضی ہمیشہ اجتماعی فلاح و بہبود ہی کے لئے کوشش کیا کرتی ہے۔ اور یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ خود غرضی ہمیشہ روشن خیال ہی ہوا کرتی ہے۔ اکثر تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ انفرادی طور پر اپنی اغراض کے لئے جدوجہد کرتے ہیں وہ اس قدر نادان یا کمزور ہوتے ہیں کہ وہ خود اپنی اغراض کو بھی پورا نہیں کر سکتے کجا کہ ان کے ہاتھوں اجتماعی مفاد کی خدمت ضرور اور ہمیشہ انجام پاتی رہے"۔ صرف یہی نہیں کہ یہ مبالغہ آمیز باتیں عقلاً صحیح نہ تھیں، بلکہ تجربہ سے خود بورژوا سرمایہ داروں کے اپنے عمل نے ثابت کر دیا کہ ان کی خود غرضی روشن خیال نہیں تھی۔ انہوں نے خریدار پبلک، اجرت پیشہ کارکن، اور پر امن حالات پیدا کرنے والی حکومت، تینوں کے مفاد کے خلاف اپنی جتھہ بندی کی اور باہم یہ سازش کر لی کہ صنعتی انقلاب کے سارے فوائد خود لوٹ لیں۔ ان کے اس باہمی ساز باز نے ان کی اُس سب سے بڑی دلیل کو خود ہی توڑ دیا جو وہ آزاد معیشت کے

حق میں پیش کرتے تھے کہ فطرۃً کسر و انکسار سے خود ہی سب کے درمیان منفعت کا توازن قائم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخر کار آدم سمتھ جیسے شخص کو بھی، جو آزاد معیشت کا سب سے بڑا وکیل تھا، یہ کہنا پڑا کہ:-

"کم ہی ایسا ہوتا ہے جب کاروباری لوگ کہیں باہم جمع ہوں اور ان کی صحبت پبلک کے خلاف کسی سازش پر اور قیمتیں چڑھانے کے لئے کسی قرارداد پر ختم نہ ہو۔ حد یہ ہے کہ تقریبات تک میں مل بیٹھنے کا جو موقع مل جاتا ہے اسکو بھی یہ حضرات اس جرم سے خالی نہیں جانے دیتے"۔

اسی طرح شخصی ملکیت اور آزادیٔ سعی کے بارے میں ان کے یہ دعوے بھی بالکل مبالغہ آمیز تھے کہ ان عنوانات کے تحت افراد کو کچھ ایسے حقوق حاصل ہیں جن پر کوئی حد عائد نہ ہونی چاہیئے۔ ایک شخص اپنی ملکیت میں اگر ایسے طریقہ سے تصرف کرتا ہے جس سے ہزارہا آدمیوں کی معیشت متأثر ہو جاتی ہے، یا ایک آدمی اگر اپنے ذاتی نفع کے لئے سعی وعمل کی کوئی ایسی راہ نکالتا ہے جس سے پوری سوسائٹی کی صحت، یا اخلاق، یا عافیت پر برا اثر پڑتا ہے، تو آخر کیا وجہ ہے کہ اسکو ان کاموں کے لئے کھلی چھٹی دیدی جائے اور قانون ایسے حدود عائد نہ کرے جن سے اس کے انفرادی حقوق کا استعمال اجتماعی مفاد کے لئے مضرت نہ ہونے پائے۔ حکومت کی عدم مداخلت کے مضمون کو ان لوگوں نے اُسکی جائز حد سے اتنا زیادہ بڑھا دیا کہ وہ برے نتائج پیدا کیئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ جب طاقت ور افراد جتھہ بندی کر کے کثیر التعداد لوگوں سے ناجائز فائدے اٹھانے لگیں اور حکومت یا تو تماشا دیکھتی رہے یا خود ان طاقت ور افراد ہی کے مفاد کی حفاظت کرنے لگے، تو اس کا لازمی نتیجہ شورش ہے، اور شورش جب برپا ہو جاتی ہے تو ہمیشہ اپنے ظہور کے لئے معقول راستوں ہی کی پابندی نہیں کیا کرتی۔

(۲) خصوصیت کے ساتھ صنعتی انقلاب کے دور میں بے قید معیشت کے اصولوں کا اتنا سخت مبالغہ اور بھی زیادہ غلط تھا۔ صنعتی انقلاب کی وجہ سے طریق پیداوار میں جو بنیادی تغیر واقع ہو گیا تھا وہ یہ تھا کہ پہلے جو کام انسانی اور حیوانی طاقت سے کیئے جاتے تھے اب ان کے لئے مشین کی طاقت استعمال کی جانے لگی۔ ایک مشین لگا لینے کے معنی یہ ہو گئے کہ دس آدمی وہ کام کرنے لگیں جو پہلے ہزار آدمی کرتے تھے۔ اس طریق پیداوار کی عین فطرت میں یہ چیز شامل ہے کہ وہ چند انسانوں کو کام پر لگا کر ہزاروں انسانوں کو بیکار کر دیتا ہے۔ ایسے ایک طریقہ کے متعلق ملکیت اور آزادیٔ سعی کے مطلق حقوق کا دعوٰے اور حکومت کی عدم مداخلت کا مطالبہ اصولاً بالکل بے جا تھا۔

آخر یہ کس طرح جائز ہو سکتا تھا کہ ایک شخص یا گروہ محض اس وجہ سے کہ وہ ایسا کرنے کے ذرائع رکھتا ہے ایک خاص قسم کا مال تیار کرنے کے لئے اچانک ایک بڑا کارخانہ قائم کر دے اور اس کی کچھ پروا نہ کرے کہ اُس کی اس حرکت سے پورے علاقے کے اُن ہزار ہا آدمیوں کے روزگار پر کیا اثر پڑتا ہے جو پہلے اپنے گھروں اور دوکانوں میں یا دستی کاریگری کی چھوٹی چھوٹی فیکٹریوں میں بیٹھے وہی مال تیار کر رہے تھے؟ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مشین کی طاقت کو صنعت میں استعمال نہ ہونا چاہیئے تھا مطلب یہ ہے کہ اس طاقت کے استعمال کی اندھا دھند اجازت نہ ہونی چاہیئے تھی اور حکومت کو اوّل روز ہی سے یہ فکر کرنی چاہیئے تھی کہ ساتھ ساتھ ان لوگوں کے روزگار کا بندوبست بھی ہوتا جائے جن کو یہ نئی صنعتی طاقت بیکار کر رہی تھی۔ چونکہ ایسا نہیں ہوا اسی وجہ سے مشینی طریق پیداوار کے وجود میں آتے ہی انسانی سوسائٹی میں بے روزگاری کا ایک مستقل مسئلہ اتنے بڑے پیمانہ پر پیدا ہو گیا جس سے تاریخ پہلے کبھی آشنا نہ ہوئی تھی۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ بے روزگاری کسی ایک مسئلہ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ انسان کی مادّی، روحانی، اخلاقی اور تمدنی زندگی کے بے شمار پیچیدہ مسائل کا مورث اعلیٰ ہے سوال یہ ہے کہ ایک فرد یا چند افراد کو کیا حق ہے کہ اپنی ملکیت میں ایسے طریقے سے تصرف کریں جس سے اجتماعی زندگی میں اتنی زبردست پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں؟ اور اس طرح کے تصرف کے بارے میں کوئی مردِ عاقل یہ کیسے دعوےٰ کر سکتا ہے کہ یہ افراد کی وہ روشن خیال خود غرضی ہے جو آپ سے آپ اجتماعی مفاد کی خدمت کرتی رہتی ہے؟ اور ایسے انفرادی تصرفات کے معاملہ میں یہ خیال کرنا کتنی بڑی حماقت ہے کہ قومی حکومت کو اس کا کھلا لائسنس دے کر خاموش بیٹھ جانا چاہیئے اور ان اثرات کی طرف سے آنکھیں بند کر لینی چاہئیں جو ایک قلیل التعداد گروہ کی کارروائیوں سے پوری قوم کی زندگی پر پڑ رہے ہوں؟

(۳) پھر اس طریقِ پیداوار نے جب ہزار ہا بلکہ لکھو کھہا آدمیوں کو بے روزگار کر دیا اور وہ مجبور ہو گئے کہ اپنے دیہات اور قصبات سے اور اپنے محلّوں اور گلیوں سے نکل نکل کر ان بڑے کارخانہ داروں اور تاجروں کے پاس مزدوری یا نوکری تلاش کرتے ہوئے آئیں، تو لامحالہ اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا اور یہی ہوا کہ یہ بھوکے مرتے ہوئے طالبینِ روزگار ان کم سے کم اجرتوں پر کام کرنے کے لئے مجبور ہو گئے جو سرمایہ داروں نے ان کے سامنے پیش کیں۔ کام ان سب کو نہ ملا، بلکہ قابلِ کار آدمیوں کا ایک حصہ مستقلاً بیکار رہا۔ پھر جنہیں کام ملا بھی وہ اس

پوزیشن میں نہ تھے کہ سرمایہ دار سے سودا چکا کر بہتر شرائط منوا سکتے، کیونکہ وہ تو خود طالب روزگار ہو کر آئے تھے۔ سرمایہ دار کی پیش کردہ شرائط قبول نہ کرتے تو شام کی روٹی تک کا بندوبست ان کے پاس نہ تھا، اور اس پر بھی کچھ اکڑ دکھلاتے تو دوسرے ہزاروں بھوکے جھپٹ کر انہی شرائط پر یہ روزگار اچک لینے کے لئے تیار تھے۔ اس طرح بورژوا حضرات کا وہ سارا استدلال غلط ثابت ہو گیا جو وہ اس اصول کے حق میں پیش کرتے تھے کہ کھلے مقابلے میں اجیر اور مستاجر کے درمیان کسر و انکسار سے مناسب اور منصفانہ اجرتیں آپ ہی آپ طے ہوتی رہتی ہیں۔ اس لئے کہ یہاں حقیقت میں مقابلے کے ساتھ اس کے کھلے ہونے کی شرط مفقود تھی۔ یہاں یہ صورت تھی کہ ایک آدمی نے ہزاروں آدمیوں کا رزق چھین کر پہلے اپنے قابو میں کر لیا۔ اور جب وہ بھوک سے تڑپ کر اس کے پاس آئے تو وہ اُن سب کو نہیں بلکہ ان کے صرف دسویں یا بیسویں حصہ کو کام دینے پر راضی ہوا۔ ایسے حالات میں ظاہر ہے کہ سودا چکانے کی ساری طاقت اس ایک شخص کے پاس جمع ہو گئی اور ان ہزاروں طالبین روزگار میں سے کوئی بھی اپنی شرائط منوانے کے قابل نہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس صنعتی انقلاب کے دور میں جدید سرمایہ داری جیسی جیسی بڑھتی گئی، سوسائٹی میں بے روزگاری کے علاوہ افلاس اور خستہ حالی کی مصیبت بھی بڑھتی چلی گئی۔ بڑے بڑے صنعتی و تجارتی مرکزوں میں جو لوگ محنت مزدوری اور نوکری کے لئے جمع ہوئے انہیں بہت کم اجرتوں پر بہت زیادہ وقت اور محنت کرنے پر راضی ہونا پڑا۔ وہ جانوروں کی طرح کام کرنے لگے۔ جانوروں سے بدتر حالت میں شہروں کے تنگ و تاریک مکانات میں رہنے لگے۔ ان کی صحتیں برباد ہونے لگیں۔ ان کی ذہنیتیں پست ہونے لگیں۔ ان کے اخلاق بری طرح بگڑنے شروع ہو گئے۔ نفسی نفسی کے عالم میں باپ بیٹے اور بھائی بھائی تک کے درمیان ہمدردی باقی نہ رہی۔ والدین کے لئے اولاد اور شوہروں کے لئے بیویاں تک وبال جان بن گئیں۔ غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ رہا جو اس غلط اور یک رخی قسم کی آزاد معیشت کے برے اثرات سے بچا رہ گیا ہو۔

(۴) اس پر مزید لطف یہ ہے کہ یہی بورژوا حضرات، جو وسیع المشربی اور جمہوریت کے زبردست داعی تھے، اور جنہوں نے لڑ بھڑ کر مالکانِ زمین کے مقابلہ میں اپنا ووٹ کا حق تسلیم کرایا تھا، اس بات کے لئے تیار نہ تھے کہ یہی ووٹ کا حق اُن لاکھوں کروڑوں عوام کو بھی حاصل ہو جن کی روزی کے یہ مالک بن گئے تھے۔

وہ اپنے لیئے تو یہ حق سمجھتے تھے کہ ایک ایک پیشے کے مالکانِ کاروبار اپنی اپنی انجمنیں بنائیں اور باہمی قرار داد سے اشیاء کی قیمتیں، نوکروں کی تنخواہیں اور مزدوروں کی اجرتیں تجویز کریں۔ لیکن وہ نوکروں اور مزدوروں کا یہ حق ماننے کے لئے تیار نہ تھے کہ وہ بھی منظم ہوں اور اجتماعی قوت سے اجرتوں اور تنخواہوں کے لئے سودا چکائیں۔ حد یہ ہے کہ ان حضرات کو اپنے اس حق پر بھی اصرار تھا کہ وہ جب چاہیں کارخانہ بند کرکے ہزارہا ملازموں اور مزدوروں کو بیک وقت بیکار کردیں اور اس طرح انہیں بھوکا مار کر کم اجرتوں پر راضی ہونے کے لئے مجبور کریں۔ مگر وہ نوکروں اور مزدوروں کا یہ حق تسلیم کرنے کے لئے بالکل تیار نہ تھے کہ وہ بھی ہڑتال کرکے اپنی اجرتیں بڑھوانے کی کوشش کریں۔ اس کے ساتھ یہ حضرات اس بات کو سراسر جائز سمجھتے تھے کہ جو شخص انکے کارخانے یا تجارتی ادارے میں خدمت کرتے کرتے بوڑھا، یا بیمار، یا کسی طور پر از کار رفتہ ہوگیا ہو اسے وہ رخصت کردیں، اگر وہ شخص جو رخصت کیا جارہا ہو، اسکی یہ گذارش ان کے نزدیک بالکل نارواتھی کہ حضور! صحت، طاقت، جوانی سب کچھ تو آپ کے کاروبار کی ترقی میں کھپا بیٹھا، اب اس جانِ ناتواں کو کہاں لے جاؤں اور ہاتھ پاؤں کی قوت کھودینے کے بعد جو پیٹ بچا رہ گیا ہے اسے کس طرح بھروں؟ یہاں پہنچ کر یہ خود حضرات اپنے اس استدلال کو بھی بالکل بھول گئے جو وہ ذاتی مفاد کو ایک ہی صحیح محرکِ عمل قرار دینے کے حق میں پیش کرتے تھے۔ انہیں اپنے متعلق تو یہ یاد رہا کہ اگر ان کے لئے نفع کے امکانات غیر محدود ہوں گے تو وہ خوب کام کریں گے اور اس طرح اجتماعی ترقی و خوشحالی کی خدمت آپ سے آپ انجام پائیگی۔ لیکن اپنے نوکروں اور مزدوروں کے معاملہ میں وہ بھول گئے کہ جس کا نفع محدود ہی نہیں بلکہ تنگ ہو، اور جس کا حال خراب اور مستقبل تاریک ہو وہ آخر کیوں دل لگا کر اور جان لڑا کر کام کرے اور کس بنا پر اپنے کام میں دلچسپی لے؟

(۵) علاوہ بریں ان لوگوں نے کاروبار کے فطری اور معقول طریقوں سے ہٹ کر اپنے ذاتی مفاد کے لئے ایسے طریقے اختیار کرنے شروع کردیئے جو صریحاً اجتماعی مفاد کے خلاف ہیں اور جن سے مصنوعی طور پر قیمتیں چڑھتی ہیں اور جن سے دولت کی پیداوار رکتی اور ترقی کی رفتار سست ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر:۔

یہ طریقہ کہ اپنے سرمائے کے زور سے اشیاء ضرورت کو خرید خرید کر ان کے کھتے بھرتے چلے جائیں یہاں تک کہ بازار میں ان کی رسد کم اور مانگ بڑھ جائے اور اس طرح قیمتیں مصنوعی طور پر گراں کی جاسکیں۔

اور یہ طریقہ کہ مال پیدا کرنے والے اور اصل استعمال کرنے والے کے درمیان، سینکڑوں آدمی محض اپنے بینک کے روپے اور ٹیلیفون کے بل پر اس کو غائبانہ بیچتے اور خریدتے چلے جائیں اور اس طرح زبردستی اُن کا منافع لگ لگ کر اسکی قیمت بڑھتی رہے بغیر اس کے کہ ان بیچ والوں نے اس مال کے پیدا کرنے یا ڈھونے یا اسے کار آمد بنانے کی کوئی خدمت انجام دی ہو جس کی بنا پر وہ منافع میں حصہ لینے کے جائز حقدار ہوں۔

اور یہ طریقہ کہ پیدا شدہ مال کو محض اس اندیشہ سے جلا دیا جائے یا سمندر میں پھینک دیا جائے کہ اتنی بڑی مقدار میں کے منڈی میں پہنچ جانے سے قیمتیں گر جائیں گی۔

اور یہ طریقہ کہ وافر سرمایہ کے بل پر ایک چیز از قسم سامانِ تعیش تیار کی جائے اور پھر اشتہار سے، ترغیب سے، مفت بانٹ بانٹ کر، طرح طرح کی سخن سازیاں کر کے زبردستی اسکی مانگ پیدا کی جائے اور اُسے اُن غریب اور متوسط الحال لوگوں کی ضروریاتِ زندگی میں خواہ مخواہ ٹھونس دیا جائے جو بیچارے اپنے فرائض حیات بھی پوری طرح بجا لانے کے قابل نہیں ہیں۔

اور یہ طریقہ کہ عامۃ الناس کو حقیقۃً جن چیزوں کی ضرورت اور شدید ضرورت ہے ان کی فراہمی پر تو سرمایہ اور محنت صرف نہ ہو اور اُن کاموں پر وہ بے دریغ صرف کیا جائے جو بالکل غیر ضروری ہیں، صرف اس لیئے کہ پہلی قسم کے کاموں کی بہ نسبت یہ دوسرے کام زیادہ نفع آور ہیں۔

اور یہ طریقہ کہ ایک شخص یا گروہ نہایت مضر صحت اور مخربِ اخلاق اور مفسدِ تہذیب و تمدن چیزوں کو اپنے سرمایئے کے زور سے خوشنما اور دلفریب بنا بنا کر لائے اور علانیہ پبلک کے سفلی جذبات کو اپیل کر کر کے انہیں اپنے اس کاروبار کی طرف کھینچے اور ان کو دیوانہ بنا بنا کر ان کی قلیل آمدنیوں کا بھی ایک معتدبہ حصہ ٹوٹے در انحالیکہ ان غریبوں کی آمدنیاں ان کا اور ان کے بال بچوں کا پیٹ بھرنے تک کے لئے کافی نہ ہوں۔

اور سب سے بڑھ کر خطرناک اور تباہ کن یہ طریقہ کہ اپنے تجارتی اور مالی مفاد کے لئے کمزور قوموں کے حقوق پر ڈاکے ڈالے جائیں، اور دنیا کو مختلف حلقہائے اثر میں تقسیم کیا جائے، اور ہر قوم کے بڑے بڑے ساہوکار اور صناع اور تاجر اپنی اپنی قوموں کو اپنی حد سے بڑھی ہوئی اغراض کا آلہ کار بنا کر ایک دوسرے کے خلاف ایسی دائمی کشمکش میں الجھا دیں جو نہ میدان جنگ میں سلجھنے پائے نہ ایوان صلح میں۔

کیا یہ سب واقعی اس بات کے ثبوت ہیں کہ اگر افراد کو اپنے ذاتی مفاد کے لئے بے روک ٹوک کام کرنے دیا جائے تو ان کے ہاتھوں اجتماعی مفاد کی خدمت خود بخود انجام پاتی رہتی ہے ؟ اس طرح تو دراصل انہوں نے اپنے عمل سے خود یہ ثابت کر دکھایا کہ بے قید خود غرضی بہت ہی کم روشن خیال ہوتی ہے ، خصوصاً جب کہ معاشی و سیاسی طاقت بھی اسی کے ہاتھ میں مرتکز ہو جائے اور قانون ساز بھی وہ خود ہی ہو۔ ایسے حالات میں تو اسکی بیشتر کوششیں اجتماعی مفاد کی خدمت میں نہیں بلکہ اس راہ میں صرف ہونے لگتی ہیں کہ جماعت کے مفاد کو اپنے ذاتی مفاد پر بھینٹ چڑھا دے۔

(۷) ان سب حرکات پر مزید غضب انہوں نے یہ کیا کہ افراد کے لئے اس بات کو بالکل جائز اور معقول اور برحق ٹھہرایا کہ وہ سرمایہ کو جمع کر کے اسے سود پر چلائیں۔ سود ایک قابل نفرت برائی کی حیثیت سے تو دنیا کے اکثر معاشروں میں ہمیشہ موجود رہا ہے اور دنیا کے قوانین نے بھی بسا اوقات اسکو بکراہت گوارا کیا ہے لیکن قدیم جاہلیت عرب کے بعد یہ فخر صرف جدید جاہلیتِ غرب کے بورژوا مفکرین کو حاصل ہوا کہ انہوں نے اسے کاروبار کی ایک ہی معقول صورت اور پورے نظام مالیات کی ایک ہی صحیح بنیاد بنا کر چھوڑا ، اور ملکی قوانین کو اس طرز پر ڈھالا کہ وہ قرضدار کے بجائے سود خوار کے مفاد کی پشت پناہ بن گئے۔ اس عظیم الشان غلطی پر اور اس کے نتائج پر تو ہم آگے چل کر ایک مستقل باب میں بحث کریں گے۔ یہاں اس سلسلۂ کلام میں مختصراً صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ سود کو قرض و استقراض اور مالی لین دین کی بنیاد بنا دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے روک ٹوک صنعتی انقلاب کی وجہ سے طاقت، دولت ، رسوخ و اثر اور تمام فوائد و منافع کا جو بہاؤ پہلے ہی ایک رُخ پر چل پڑا تھا وہ اس کارروائی کی وجہ سے اور زیادہ یک رُخا ہو گیا اور اسکی بدولت اجتماعی زندگی کا عدم توازن اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ اب سوسائٹی میں سب سے زیادہ خوش قسمت وہ لوگ ہو گئے جو کسی نہ کسی ترکیب سے کچھ سرمایہ اکٹھا کر کے بیٹھ گئے ہوں۔ دماغی قابلیت رکھنے والے، محنت کرنے والے، کاروباری اسکیمیں سوچنے اور اس کی تنظیم کرنے والے ، اپنی جان کھپا کر کاروبار کو ہر مرحلے میں چلانے والے ، اور اشیاء ضرورت کی تیاری و فراہمی کے سلسلے کی ساری خدمات انجام دینے والے ، غرض سب کے سب اُس ایک آدمی کے سامنے ہیچ ہو گئے جو کاروبار میں روپیہ قرض دے کر اطمینان سے گھر بیٹھا ہوا ہو۔ ان سب کا نفع غیر معین اور غیر یقینی ہے اور اس کا نفع معین اور یقینی۔ ان سب کے لئے نقصان

کا خطرہ بھی ہے مگر اس کے لئے خالص منافع کی گارنٹی۔ یہ سب کاروبار کے بھلے اور برے میں دلچسپی لینے پر مجبور ہیں، اور وہ ہر چیز سے بے پرواہ صرف اپنے سود سے غرض رکھتا ہے۔ کاروبار فروغ پاتا نظر آئے تو وہ بے تحاشا اس میں سرمایہ لگانا شروع کر دیتا ہے یہاں تک کہ نفع کے امکانات ختم ہونے لگتے ہیں۔ کاروبار سرد پڑتا نظر آئے تو وہ مدد کے لئے ہاتھ نہیں بڑھاتا بلکہ پہلے کا لگا ہوا سرمایہ بھی کھینچنے لگتا ہے یہاں تک کہ ساری دنیا پر سخت کساد بازاری کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ ہر حال میں نقصان، زحمت، خطرے سب کچھ دوسروں کے لئے ہیں اور اس کے لئے حد سے حد اگر کوئی اتار چڑھاؤ ہے تو وہ صرف نفع کی کمی بیشی کا۔ تاجر اور صناع اور زمیندار ہی نہیں، حکومتیں تک اس کی مزدوری بنی ہوئی ہیں۔ اس کے دیئے ہوئے روپے سے وہ سڑکیں، ریلیں، نہریں اور دوسری چیزیں بناتی ہیں اور برسوں نہیں، صدیوں، ایک ایک شخص سے ٹیکس وصول کر کرکے اس کا سود اس کے گھر پہنچاتی رہتی ہیں۔ حد یہ ہے کہ قوم کو اگر کوئی لڑائی پیش آجاتی ہے تو جس کی جان جائے، یا جس کے ہاتھ پاؤں کٹیں، یا جس کا گھر برباد ہو، یا جو اپنے باپ، بیٹے یا شوہر سے محروم ہوں، ان سب کے بارے تو قومی خزانہ بآسانی سبکدوش ہو جاتا ہے، لیکن قوم ہی کے جن چند افراد نے لڑائی کے لئے سرمایہ قرض دے دیا ہو ان کا سود سو سوا اور دو دو سو برس تک ادا کیا جاتا رہتا ہے اور اس سود کی ادائیگی میں ان لوگوں تک کو "چندہ" دینا پڑتا ہے جنہوں نے اسی جنگ میں جانیں قربان کی تھیں۔ اس طرح یہ سودی نظامِ مالیات سوسائٹی کی دولت پیدا کرنے والے اصل عاملین کے ساتھ ہر طرح، ہر جہت میں ایک ہمہ گیر بے انصافی کرتا ہے۔ اس نے ساری اجتماعی معیشت کی باگیں چند خود غرض سرمایہ داروں کے ہاتھ میں دے دی ہیں جو نہ تو اجتماع کی فلاح و بہبود سے کوئی دلچسپی رکھتے ہیں، نہ فی الواقع اجتماع کی کوئی خدمت ہی انجام دیتے ہیں، مگر چونکہ پورے معاشی کاروبار کی جان، یعنی سرمایہ ان کے قبضہ میں ہے اور قانون نے ان کو اسے روک رکھنے اور سود پر چلانے کے اختیارات دے رکھے ہیں، اس لئے وہ صرف یہی نہیں کہ اجتماع کی مجموعی محنت سے پیدا ہونے والی دولت کے شریکِ غالب بن گئے ہیں، بلکہ ان کو یہ طاقت حاصل ہو گئی ہے کہ پورے اجتماع کو اپنے مفاد کا خادم بنا لیں اور قوموں اور ملکوں کی قسمتوں سے کھیلتے رہیں۔

(۷) جدید سرمایہ داری کی ان بنیادوں پر جو نیا معاشرہ وجود میں آیا وہ ہمدردی، تعاون، رحم، شفقت اور اس نوع کے تمام جذبات سے عاری اور اس کے برعکس صفات سے لبریز تھا۔ اس نظام میں غیر تو غیر، بھائی پر

بھی بھائی کا یہ حق نہ رہا کہ وہ اسے سہارا دے۔ ایک طرف ہر نئی مشین کی ایجاد سینکڑوں اور ہزاروں کو بیک وقت بیکار کیئے دے رہی تھی، اور دوسری طرف حکومت، سوسائٹی، کارخانہ دار یا ساہوکار کسی کی بھی یہ ذمّہ داری نہ تھی کہ جو لوگ بے روزگار ہو جائیں، یا کام کرنے کے قابل نہ ہوں، یا ناکارہ ہو جائیں، ان کی بسر اوقات کا کوئی بندوبست کرے۔ یہی نہیں بلکہ اِس نئے نظام نے ایسے حالات پیدا کر دیئے اور ایسے اخلاقیات بھی عام لوگوں کے اندر اُبھار دیئے کہ کسی گرے ہوئے یا گرتے ہوئے انسان کو سنبھالنا کسی کا فرض ہی نہ رہا۔ حوادث، بیماری، موت، اور تمام دوسرے ناموافق حالات کے لئے اس نظام نے جتنے علاج بھی تجویز کیئے، اُن لوگوں کے لئے کئے جو فی الوقت کما رہے ہوں، اور اپنی موجودہ ضروریات سے اتنا زیادہ کما رہے ہوں کہ کچھ پس انداز کر سکیں۔ لیکن جو کما ہی نہ رہا ہو، یا بس بقدرِ سدِّ رمق کما رہا ہو وہ اپنے برے وقت پر کہاں سے مدد پائے؟ اس کا کوئی جواب جدید سرمایہ داری کے پاس اِس کے سوا نہیں ہے کہ ایسا شخص مہاجن کے پاس جائے اور اپنے پہننے کے کپڑے یا گھر کے برتن یا جورو کا زیور رہن رکھ کر تین تین سو فی صدی سالانہ سود پر قرض لے، اور جب یہ قرض مع سود ادا نہ ہو سکے تو پھر اُسی مہاجن سے اسی کا قرض و سود ادا کرنے کے لئے مزید سودی قرض لے لے!

(۸) ظاہر ہے کہ جب سوسائٹی میں لاکھوں آدمی بے روزگار ہوں، اور کروڑوں اِس قدر قلیل المعاش ہوں کہ سخت حاجت مند ہونے کے باوجود وہ مال نہ خرید سکیں جو دوکانوں میں بھرا پڑا ہو، تو صنعت اور تجارت کو پورا پورا ممکن فروغ کس طرح ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم یہ عجیب و غریب صورتِ حال دیکھ رہے ہیں کہ اگرچہ ابھی دنیا میں بے حد و حساب قابلِ استعمال ذرائع موجود ہیں، اور کروڑوں آدمی کام کرنے کے قابل بھی موجود ہیں، اور وہ انسان بھی کروڑہا کروڑ کی تعداد میں موجود ہیں جو اشیاءِ ضرورت کے محتاج اور اشیاءِ عیش و رفاہیت خریدنے کے خواہش مند ہیں، مگر یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی دنیا کے کارخانے اپنی استعداد کار سے بہت گھٹ کر جو مال تیار کرتے ہیں وہ بھی منڈیوں میں اس لئے پڑا رہ جاتا ہے کہ لوگوں کے پاس خریدنے کو روپیہ موجود نہیں، اور لاکھوں بے روزگار آدمیوں کو کام پر اس لئے نہیں لگایا جا سکتا ہے کہ جو تھوڑا مال بنتا ہے وہی بازار میں نہیں بکتا، اور سرمایہ اور قدرتی ذرائع بھی پوری طرح زیرِ استعمال اس لئے نہیں آنے پاتے کہ جس قلیل پیمانے پر وہ استعمال میں آ رہے ہیں اسی کا بارآور ہونا مشکل ہو رہا ہے کجا کہ مزید ذرائع کی ترقی پر مزید سرمایہ لگانے کی

کوئی ہمت کر سکے۔ یہ صورت حال پور ژوا مفکرین کے اُس استدلال کی جڑ کاٹ دیتی ہے جو وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے تھے کہ بے قید معیشت میں اپنے انفرادی نفع کے لئے افراد کی تگ و دو خود بخود ذرائع و وسائل کی ترقی اور پیداوار کی افزائش کا سامان کرتی رہتی ہے۔ ترقی اور افزائش تو درکنار، یہاں تو تجربے یہ ثابت ہوا کہ انہوں نے اپنی نادانی سے خود اپنے منافع کے راستے میں بھی روکاوٹیں پیدا کر لیں۔ (باقی آئندہ)

ہندوستان کے خریداروں کی خدمت میں گذارش

انڈیا کے جو باشندے رسالہ ترجمان القرآن کے خریدار ہیں۔ اُن کے لئے گذارش ہے کہ بدلے ہوئے حالات کے تحت رسالے کا سالانہ چندہ مبلغ ساڑھے سات روپے ؛ فی پرچہ گیارہ آنے؛ کر دیا گیا ہے۔ جب تک ہندوستان اور پاکستان کے درمیان منی آرڈر یا وی پی کا سلسلہ بند ہے اس وقت تک وہ اپنی رقوم ان تین مراکز الہ آباد۔ حیدرآباد دکن اور بھوپال کو روانہ کریں۔ نئے خریدار بھی انہیں جگہوں پر اپنے چندے بھیجیں۔ پتے حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ الہ آباد۔ جناب حکیم محمد خالد صاحب، ڈاکخانہ ہرداره۔ الہ آباد۔ یو پی

۲۔ حیدرآباد دکن۔ جناب سید عبد القادر صاحب مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد دکن۔

۳۔ بھوپال۔ جناب سید ظہیر الحسن صاحب مکتبہ جماعت اسلامی نور محل بھوپال۔

(۱) الہ آباد۔ یو پی۔ سی۔ پی۔ دہلی۔ راجپوتانہ۔ مغربی بنگال۔ اوڑیسہ۔ بہار۔ بھوٹان۔ نیپال آسام۔

۲۔ حیدرآباد دکن۔ حیدرآباد دکن۔ میسور۔ مدراس۔ ٹراونکور۔ ساحل مالابار

۳۔ بھوپال۔ بھوپال۔ وسط ہند کی ریاستیں۔ صوبہ متوسط۔ بمبئی۔ گجرات۔ برار۔

چندے اپنے حلقے کے مرکز کو روانہ کیے جائیں۔ منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن پر مکمل پتہ اور نمبر خریداری ضرور تحریر کیا جائے۔ نیز جس وقت دونوں حکومتوں میں مفاہمت ہو جائے تو اس وقت براہ راست رقمیں دفتر رسالہ ترجمان القرآن لاہور کو ارسال کرنی شروع کر دیں۔

(منیجر دفتر رسالہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور)